ماہنامہ

نئی دہلی

منادی

بارگاہِ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ محبوبِ الٰہی کا



مدیر

خواجہ حسن ثانی نظامی

معاون مدیر

خواجہ سید مہدی نظامی

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط وکتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ:
خواجہ حسن ثانی نظامی ۱۱۰۰۱۳
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی

سالانہ قیمت	پندرہ روپے
غیر ممالک سے	چھ ڈالر
فی پرچہ	ایک روپیہ ۵۰ پیسے

منادیاً ینادی للایمان

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء

محبوب الٰہی سے ایمان اور امن کی ندا دینے والا

اور ان کے جانشین

امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی کی یادگار

ماہنامہ منادی نئی دہلی

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے۔ یہ اکسٹھویں جلد (۱۹۸۶ء) کا بارھواں شمارہ ہے

سرخ لکیر

عنوان کے نیچے ایک سرخ لکیر کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ادا کردہ منادی کی قیمت اس شمارے سے ختم ہو گئی۔ اور دو لکیروں کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ شمارے سے ختم ہو جائے گی۔ جلد منی آرڈر کے ذریعہ قیمت بھیج کر ممنون فرمایئے یا وی پی کی اجازت دیجیے۔ وی پی میں آپ کے تین روپے پچیس پیسے زائد خرچ ہوں گے۔

(مینیجر)

فہرست

پرنٹر پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے جمال پرنٹنگ پریس اور خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ سے شائع کیا۔

قصیدہ در مدح مولائے کائنات

(حضرت مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندرؒ)

سر بر آراست اندر دل جہاں پرور شہنشا ہے — علیؑ نائے نبی شانے سلیماں عزت و جاہے
امیر فاتح باب ولایت مرجع دوراں — علیؑ مرتضیٰ قرآنِ ناطق حجۃ اللّٰہے
امام العارفین صفدر، امیر المومنیں حیدر — جہاں آرا بہار افزا عجب شاہے ست دیجاہے
حبیب مصطفیٰ، مولائے عالم راحت جانہا — درخشاں زوست قلب تیرہ ام مثل شب ماہے
فروزاں گشت جان و دل گلستاں گشت آب و گلِ — نظر فرمود یک ساعت چو بر من عرش خرگاہے
ضیا بخشے گہر پاشے جمیل عشق افزائے — تصدق بر رُخ پاکش ہمہ از مہر تا ماہے
بہ تمثیل صفاتِ انبیا ضرب المثل ذاتے — علیؑ مشکل کُشا نفسِ نبی نور دیدۂ اللّٰہے
ہمہ دلہا گرفتارش ہمہ جانہا خریدارش — ہمہ عالم طلبگارش فتادہ بر سر راہے
وصالش عاشقاں را نعمتِ کونین بخشائے — جمالش طالباں را فرح بخش و مشعل راہے
قلوب المومنین را عرش فرمودست پیغمبرؐ — ترا عرشِ قلوبِ عارفاں گشتہ گزرگاہے
گدایانِ در اقدس شرف دارند بر شاہاں — بہ مشتاقاں ہمی بخشند خوش عیشے بہ یک آہے

تولّائیش حیاتِ من، تمنایش نجاتِ من
فدایش باد ذاتِ من علیہ رحمۃ اللّٰہے

انتخاب فوائد الفواد

ملفوظات سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہیؒ

از صاحب الفضل خواجہ حسن علا سجزیؒ ترجمہ: خواجہ حسن ثانی نظامی

اولیاء اللہ کی موت اور زندگی

اولیاء کی موت کے ذکر میں یہ حکایت بیان فرمائی کہ بدایوں میں میرے ایک دوست تھے احمد نام تھا۔ بہت صالح اور عبادت گزار اور ابدال صفت تھے۔ اگرچہ بے پڑھے لکھے تھے مگر ہمیشہ شرعی مسائل اور ان کے احکام کی تحقیق میں لگے رہتے تھے اور ہر ایک سے یہی پوچھتے رہتے تھے جب میرا دہلی آنا ہوا تو وہ بھی دہلی آ گئے۔ ایک روز راستے میں ملاقات ہوئی۔ مجھے دیکھا تو بڑی گرم جوشی سے حال پوچھا۔ اس کے بعد میری والدہ کے بارے میں دریافت کیا۔ ان کو میری والدہ کی بیماری کا تو علم تھا لیکن انتقال کا علم نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ والدہ تو اللہ کو پیاری ہوئیں بولے اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ پھر بڑا اضطراب ظاہر کیا۔ حالت غیر ہو گئی اور رونے لگے۔ جب خواجہ ذکرہٗ اللہ بالخیر حکایت کے اس حصے تک پہنچے تو اس قدر گریہ طاری ہوا کہ جو کچھ فرماتے تھے پوری طرح سنا نہیں جاتا تھا۔ گریے کے دوران یہ دو شعر زبان مبارک پر آئے۔ خدا معلوم ان احمد صاحب سے روایت فرمائے یا حضرت کو خود ہی یاد آئے۔ الغرض شعر یہ تھے۔

افسوس دلم ہیچ تدبیر نکرد — قبہلۂ وصال را بزنجیر نہ کرد
گر وصل تو یاری کند دیانہ کند — باری کہ فراق ہیچ تقصیر نہ کرد

اس کے بعد فرمایا کہ کچھ عرصے بعد ان احمد صاحب نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ میں نے ان کے انتقال کے بعد ان کو ایک رات خواب میں دیکھا کہ ہمیشہ کی طرح اور اپنی عادت کے موافق مجھ سے مسائل اور احکام پوچھ رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ جو کچھ پوچھ رہے ہیں یہ (چیزیں) تو زندگی میں کام آتی ہیں۔ (اور آپ تو مر چکے ہیں) کیا آپ مردہ نہیں ہیں؟ جب انھوں نے یہ بات سنی تو مجھ سے کہنے لگے کہ آپ خدا کے دوستوں کو مردہ کہتے ہیں!

کینچلی

جناب سید حامد، سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

موت کی تیاری لوگ طرح طرح سے کرتے ہیں، بعض تیاری بغیر ہی چلے جاتے ہیں۔ بعض افراد زندگی سے اس قدر اکتا جاتے ہیں کہ خودکشی کر لیتے ہیں۔ یہ عجیب فعل ہے کامیاب ہو گیا تو کوئی جرم نہیں بنتا ہے۔ ناکام ہوا تو تعزیرات ہند کا ہدف بن گیا۔ دوسرے جرائم ناکامی پر ہلکے ہو جاتے ہیں اور سزا میں بھی تخفیف ہو جاتی ہے۔ خودکشی میں صورت حالات اس کی الٹی ہے۔ چونکہ خودکشی بذات خود جرم نہیں ہے۔ اس لیے اقدام خودکشی پر جو سزا ملتی ہے وہ ناکامیابی کی سزا ہے۔ قانون اس بات پر چیں بہ جبیں ہوا کہ اس شخص میں خودکشی کرنے کا سلیقہ نہ تھا، اس نے بھونڈا اور بے اثر طریقہ اختیار کیا اپنی زندگی سے جدا ہونے کا۔ بھونڈے پن کی سزا ملنی چاہیے۔

ہمارے قانون کی ٹھنڈی منطق پر غور کیجیے۔ ایک شخص مصیبتوں کا مارا ہوا، زندگی کا ستایا ہوا، چاہتا ہے کہ موت کے دامن میں جاکر پناہ لے۔ ایک طرف تو اس کی کوشش ناکامیاب ہوئی اور جن مصیبتوں سے وہ بھاگا تھا، انھوں نے اسے پھر دبوچ لیا؛ دوسری طرف اس پر جرم کا ٹھپہ بھی لگ گیا اور پولس اور عدالت نے چکی کے دو پاٹوں کی طرح اسے پیس دیا۔ یہ کون سا انصاف ہے؟ جبھی تو لوگ کہتے چلے آئے ہیں کہ قانون اندھا ہے؛ اسے مرے پر سو دُرّے لگانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ سزا اور جزا میں امتیاز کرنا کبھی کبھی اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔

موت سے لوگ ڈرتے ہیں، کسی نے کہا ہے یہ اسی قسم کا ڈر ہے جو اکیلا آدمی گھپ اندھیرے میں محسوس کرتا ہے۔ معلوم نہیں مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ کہاں جائیں گے۔ کہیں ٹھکانا ملے گا بھی کہ نہیں۔ روح کا کیا حشر ہوگا۔ کیا رات دن بھٹکتی رہے گی، یا زندگی کے وسوسوں اور خرخشوں سے نجات پاکر مطمئن اور مسرور ہوگی۔ اور کچھ لوگ اس خیال سے دہشت زدہ ہوتے ہیں کہ جسم جس کے ذریعے وہ خود کو پہچانتے ہیں اور جس کے توسط سے وہ جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ جسم سڑ جائے گا کیڑے مکوڑوں کی غذا بن جائے گا یا چیل کوّے اسے کھا جائیں گے۔ یا ایک حصہ آگ کی لپٹ میں دھواں بن کر اڑ جائے گا اور دوسرا راکھ کے ڈھیر کی شکل اختیار کرے گا۔

زیادہ تر لوگ اس خیال سے خائف رہتے ہیں کہ جانکنی کی تکلیف برداشت نہ ہو پائے گی، نزع کی صعوبت جان لے کر جائے گی۔ ایک پل میں خاتمہ ہو جاتا تو اچھا تھا۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینا، یہ ہفت خوان کیسے طے ہوگا۔ ایسا لگے گا کہ دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جا رہے ہیں، پسینے چھوٹنے لگیں گے۔

جن لوگوں نے مردم آزاری بہت کی ہے، لوگوں کو ستایا ہے، ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے، ظلم کیا ہے، لوگوں کا حق مارا ہے غریبوں اور سائلوں اور غرض مندوں کو دھتکارا ہے، بزرگوں کے ساتھ گستاخی کی ہے، محسنوں کو آنکھیں دکھائی ہیں، فریب، ریاکاری، اور حرص و حسد کو شعار بنایا ہے، انھیں موت سے زیادہ ڈر لگتا ہے وہ سمجھتے ہیں یہ ساری خود غرضیاں، دل آزاریاں،

حرص و فریب ان کو سانپ کی طرح ڈسیں گے، زہر رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ معلوم ہوگا جسم پھٹا جارہا ہے، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا ہے۔ ان کا نامۂ اعمال جس وقت پیش ہوگا وہ شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انھیں تلافیٔ مافات کا موقع مل جائے۔ وہ اپنی جفاؤں کو مظلوموں سے معاف کرالیں، گناہوں سے توبہ کرلیں اور پاک و صاف زندگی گزار لیں، اول تو ہماری زندگی کی بناوٹ ایسی ہے کہ موقع ملتا ہی نہیں۔ جو گھڑی ایک بار آکے گئی وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔ زندگی کو ایک سفر جانیے تو ایک اسٹیشن جسے گاڑی چھوڑ چکی ہے، دوڑ کر گاڑی کو نہیں پکڑ سکتا۔ یہی حال مواقع کا ہے۔ ایک بار ایک موقع ہاتھ سے گیا پھر ہاتھ نہیں آئے گا، چاہے زندگی بھر حسرت میں ہاتھ ملتے رہیے۔ اور اگر کسی کو مہلت مل گئی تو وہ اپنے دیرینہ مشاغل میں لگ جاتا ہے کفارے اور تلافی کا خیال بھی اس کے دامن دل کو نہیں چھوتا۔ اسی لیے ایسی توبہ معتبر نہیں ہوگی جو اس وقت کی جائے جب انسان زندگی سے جدا ہو رہا ہے۔ اس توبہ کا وزن ہی کیا جو مجاہدہ اور ضبط کی ترازو میں نہ تولی جا سکے، جسے کڑی آزمائش سے گزرنا نہ پڑے۔

اس سے بھی کچھ زیادہ بے بسی وہ لوگ محسوس کرتے ہیں جو اپنے خاندان کے تئیں ذمہ داریاں پوری نہیں کر پائے ہیں۔ بیوی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا، اس کا سب کچھ لٹ جائے گا۔ ننھے ننھے بچوں کا کیا ہوگا۔ بہنیں جن کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں، کیا کریں گی۔ بوڑھی ماں جو بیٹھی ہوتی ہے اسے کون دیکھے گا۔

جن لوگوں نے ظلم ڈھائے ہیں، وہ ڈرتے ہیں کہ مظلوم ان کا پیچھا کریں گے، ان سے بھاگ کر وہ کہاں جائیں گے۔ وہ ہانپتے ہوئے تھک کر گر جائیں گے۔ اور جانے والے کل کے مظلوم آنے والے کل کے دن درندوں کی طرح انھیں پھاڑ کھائیں گے۔ ضمیر زندگی بھر موقع پاکر انھیں کھسوٹتا رہا، ضمیر کی ساری خلشیں مجسم اور مہیب ہو کر ان کی تکا بوٹی کر دیں گی۔

وہ لوگ جن کے سارے معاملات پھیلے ہوئے اور حسابات بکھرے ہوئے رہتے ہیں جو عادتاً ہر کام کو آخری وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ انھیں نہ موت کے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے نہ اس کی عقوبت سے بلکہ یہ تکلیف دہ خیال انھیں کھائے جاتا ہے کہ موت ایک دم اچانک آجائے گی۔ اور انھیں حساب کو سمیٹنے اور بساط کو بچھانے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ ان کا حال کچھ اس طالب علم کا سا ہوگا جسے امتحان میں پانچ سوالوں کا جواب دینا ہے اور جس نے تین چوتھائی سے زیادہ وقت پہلے سوال کی نذر کر دیا ہے۔ چوتھائی وقت میں چار سوال کیسے حل کیے جائیں گے؟ گھبراہٹ سی گھبراہٹ پریشانی سی پریشانی۔

پھر وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے آخری ایام میں اپنی غلطیوں سے دوسروں کو عبرت پہنچانا چاہتے ہیں۔

ہمہ کارم بہ شد بہ نادانی۔ من نہ کردم شما حذر بکنید

میرا کام تو نادانی میں تمام ہو گیا۔ میں غلطیوں سے بچ نہ سکا تم ان سے پرہیز کرنا۔

آپ ہی سوچیے اس پند لب بام سے کیا حاصل۔ پرہیز جب آپ نہیں کر سکے تو ہمیں کیا سکھاتے ہیں۔ خود پرہیز کیا ہوتا تو ہم بلا کہے آپ کے نقش قدم پر چلتے۔ "میں نے غلطی کی تم نہ کرنا" کیا خوب گویا غلطی کرنے کا حق صرف آپ ہی کو تھا۔ "میں تو زندگی بھر کھیلا کیا، لیکن تم کھیل کے میدان میں قدم نہ رکھنا" یہ بھی کوئی بات ہوئی؟

مرنے والا خطرے کی گھنٹی بجائے گا تو کون سنے گا۔ سب یہ سوچیں گے کہ یہ اس خطرے سے خوف زدہ ہے جو اسے درپیش ہے۔ جو خود ڈوب رہا ہو وہ آئندہ ڈوبنے والوں کو کیسے بچائے گا، کیا یہ کہہ کر کہ زنہار پانی

کے قریب نہ آنا؟ آخر کیوں نہ آئیں۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ مرنے والے سے لوگ سلامتی ہوش و حواس منسوب نہیں کرتے۔ شاعر نے کہا بھی ہے کہ ہم نے ہوش و حواس اور تاب و تواں آگے بھیج دیے ہیں یہ ساز و سامان چلا گیا اب ہم بھی جاتے ہیں۔ تاکہ جب نئے گھر میں پہنچیں تو وہاں ضرورت کا سارا سامان ہمیں سجا ہوا پہلے سے مل جائے۔ یہ دستور تھا اس وقت جب حکام ضلع دورہ کیا کرتے تھے۔ اب تو دھیا چھو کر چلے آتے ہیں۔ زیر صدر مقام میں بہت اہم لوگوں کا نزول اجلال ہوتا رہتا ہے وزیر یا باتدبیر تو خود عوام کے قریب آتے ہیں دافراں کو آنے دیتے ہیں۔ دستور یہ تھا کہ پہلے پڑاؤ پر پہنچتے ہی دوسرے پڑاؤ کا سامان کیا جاتا تھا ایک خیمہ اور اس کے لوازمات اگلے پڑاؤ کے لیے روانہ کر دیے جاتے تھے تاکہ جب پہلے پڑاؤ سے کوچ کر کے آپ وہاں پہنچیں تو کوئی تکلیف نہ ہو، ادھر ادھر بھٹکنا اور انتظار کرنا نہ پڑے۔

شعراء کہ ایک چھٹی حس رکھتے ہیں اس دنیا کو ایک پڑاؤ کہتے چلے آئے ہیں انسان اپنے طویل سفر میں یہاں سستانے کے لیے رکتا ہے اور دم لے کر آگے بڑھتا ہے۔ پڑاؤ کو جو نادان منزل سمجھ بیٹھیں ان کا خدا حافظ ہے۔ کتنے ہیں ہم میں سے جو اس زندگی کو منزل اور منتہا نہیں سمجھتے؟

لیکن مرنے والے کی اور باتیں، خصوصاً پند و نصیحت، آگاہی اور عبرت، انتباہ اور حسرت کی دوسری باتیں لوگ سنیں یا نہ سنیں، دو باتیں ضرور کان لگا کر سنتے ہیں۔ پہلی بات عزیز و اقارب اور امیدوار سنتے ہیں۔ دوسری بات پولیس اور عدالت۔ میرا اشارہ سخن ترتیب کے ساتھ وصیت اور بیان قبل از موت" (ڈائنگ ڈیکلریشن) کی طرف ہے۔ وصیت کا نفع براہ راست امیدوار عزیزوں کو پہنچتا ہے (یا کبھی کبھی نہیں پہنچتا)۔ دوسرے مذکورہ بیان کا فائدہ پولیس والوں (اور نقصان بعض اوقات، انصاف) کو پہنچتا ہے۔ جس وقت سلامتی ہوش و حواس بالعموم مشتبہ ہوتی ہے، عین اسی وقت یہ سلامتی ہوش و حواس بیان دینے والے (اظہار کنندہ) سے منسوب اور اس کے بارے میں قلم بند کی جاتی ہے۔ قانون یہ تصور کرتا ہے کہ جو شخص دنیا کو چھوڑ رہا ہے اور زندگی کے علایق کو توڑ رہا ہے، جسے جلد ہی اپنے اعمال کا دفتر اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے پیش کرنا ہے، جو وابستگی اور دشمنی کی گرد سے دامن جھاڑ کر پرواز کے لیے پر تول رہا ہے، وہ جھوٹا بیان نہیں دیگا۔ سچی سچی، کھری کھری بات کہہ دیگا۔ اسے اب کیا لینا دینا ہے۔

موت سکون کے ساتھ بھی آتی ہے اور تکلیف کے ساتھ بھی، جان گداز تکلیف کے ساتھ۔ کچھ لوگ عارضی نیند کو دائمی نیند میں بدل دیتے ہیں، سوتے سوتے اٹھا لیے جاتے ہیں۔ بعض گھنٹوں، بعض ہفتوں جانکنی کے عالم میں رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اور کس کس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ ہی جانے۔ شاید یہاں نیک و بد کی تفریق بھی نہیں ہوتی۔

موت کو طول دینا یا مختصر کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن موت کے بعد جسم پر جو گزرتی ہے، اس کو انسان اکثر خواہ مخواہ طول دے دیتے ہیں۔ اور جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے (عرف عام میں)، اتنا ہی زیادہ طول (پس از مرگ واویلا) کو دیا جاتا ہے مرنے والے کو تماشا بنا دیتے ہیں۔ لوگ درشن یا زیارت کے لیے جوق در جوق آتے ہیں اور جس شخص کی زندہ و تابندہ شخصیت کے نقوش ان کے ذہن پر ہیں، اس شخص کی بگڑتی ہوئی بے جان شکل، بے نور چہرے اور پوپلے منہ اور لاچاری، ان کی نگاہوں میں اس طرح پیوست ہو جاتی ہے کہ پہلے نقوش سب دھل جاتے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ پہلے تاثرات کو بگاڑنے کی ضرورت تھی۔ کوچے میں کسی کی نعش کو کھینچے پھرنے

سے کیا حاصل ؟ اگر مقصد یہ ہوتا کہ انسان دنیا کی زندگی اور اس کے اقتدار کی بے ثباتی سے آشنا ہو جائے، تو بھی کوئی بات ہوتی۔ عبرت کے لیے پہلے سولی پر چڑھا کر پیڑ پر لٹکا دیا کرتے تھے۔ لیکن یہاں مقصد مختلف ہے۔ مرنے والے کی عظمت کا اعتراف اور اسے خراج ادا کرنا لیکن تاثر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ میں نے ایک بہت بڑے آدمی کو جو خوبرو، جامہ زیب خوش قطع اور عہد آفریں تھا۔ آخری سفر پر جاتے ہوئے دیکھا۔ قبر کی کف خاک والی بات بھی تو نہیں تھی۔ کس قدر حقیر، کتنا بدنما، کیسا لاچار، کتنا عبرت خیز۔ اب اس بطل جلیل، اس پیکر جمیل کا تصور کرتا ہوں تو وہ آخری تاثر پہلے تاثر سے گڈمڈ ہو جاتا ہے اور لطف کو کرکرا کر دیتا ہے۔ ایک اور بزرگ کے آخری سفر کا مشاہدہ کیا۔ میت دلی سے لکھنؤ کی طرف جا رہی تھی۔ برف کی سلوں پر رکھی ہوئی۔ بے جان جسم آماسیدہ لگتا تھا، پھولا ہوا تھا، دلی میں تجہیز و تکفین و تدفین کر دیتے تو کیا جاتا۔ یہ ایک ایسے شخص کی نعش تھی جس کی ذہانت، موشری، پیش قدمی اور ابتکار کی دنیا قایل تھی اس کی لاچاری اور اس کے جسد بے روح کو مشتہر کرنے سے کیا ملا؟ یہی نا کہ گھر جا کر دفن ہوئے۔ گھر کی مٹی کیا مختلف ہوتی ہے۔ انسان خاک سے اٹھتا ہے اور اسی میں جا ملتا ہے انسانوں کو خانوں میں بانٹ کر کیا مل گیا، جو خاک کے خانوں میں بانٹے چلے ہیں؟ یہ دونوں بزرگ اگر کسی طرح زندہ ہو کر ایک عام آدمی کی طرح اپنی میت کے جلوس کو دیکھ سکتے تو سر پیٹ لیتے اور آخری رسوم ادا کرنے والوں کی خیر نہ ہوتی۔

خول کے اندر جو کچھ تھا وہ تو پرواز کر گیا۔ خول میں اب کیا رہا ہے۔ اب اس کی نمایش کیوں کرتے ہو؟ مٹی کے قالب کی خیرازہ بندی روح نے کی تھی، اسے قد و قامت اور خد و خال دیے تھے، اس میں جان ڈال دی تھی اسے حرکت سے آراستہ کیا تھا۔ اس کی نس نس میں شادابی کی لہریں دوڑا دی تھیں۔ روح رخصت ہو گئی۔ اب مٹی کے اس قالب میں کیا رہا۔ مرادآباد میں ظروف ڈھالنے کا کاروبار ہوتا ہے۔ مٹی کے سانچے بنائے جاتے ہیں سیال دھات ان میں انڈیلی جاتی ہے جو ظرف کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ظروف نکال لیے جاتے ہیں تو سانچے مٹی کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ یہی حال انسان کا ہے۔ اس مٹی کے ڈھیر کی نمایش کوئی آخر کیوں کرے؟

زندگی خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔ پیکر بناتی ہے اور انھیں توڑتی ہے۔ روح ایک ایسی شمشیر ہے جس کے لیے بقول اقبال جسم کی نیام سنگ فساں کا کام کرتی ہے۔ شاہ آرتھر کی تو تلوار ہی سمندر میں ڈال دی گئی تھی، ہم نیام کو لے کر گھومتے ہیں۔ چڑیا اڑ گئی اور پنجرے کی نمایش ہو رہی ہے۔ چمکتا اور دمکتا ہوا، خوش خرام، خاموش، تیز رو، لچکدار، سانچے میں ڈھلا ہوا خوبصورت سانپ، کینچلی اتار کر آگے بڑھ گیا۔ ہم ملگجی کینچلی کو سینے سے لگا رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ سانپ یہی ہے کینچلی اتار پھینکنے میں سانپ کو اس قدر زحمت بھی نہیں ہوتی جتنی ہمیں کپڑے اتارنے میں ہوتی ہے۔ روح کا بھی یہی عالم ہے، وہ بھی جب چاہتی ہے جسم کو کینچلی کی طرح اتار دیتی ہے۔ انگریزی میں کینچلی کے ساتھ ایک حرف (پری پوزیشن) جوڑ دیتے ہیں۔ لیجیے جو لفظ ابھی اسم تھا فعل بن گیا۔ انگریزی زبان کی توانائی کا ایک راز یہ ہے کہ اس میں اسم کو، جو جامد ہوتا ہے، فعل بہ آسانی بنا لیا جاتا ہے اور اس طرح ایک جامد یا ثابت حرکت میں آجاتا ہے سیارہ بن جاتا ہے کینچلی اتار دینے سے مفہوم لیا جاتا ہے کسی شے، وصف یا عادت کو خیرباد کہہ دینا۔ روح جب چاہتی ہے جسم کو خیرباد کہہ دیتی ہے۔

اور وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو ایسا سوچنے اور سمجھنے پر قادر ہیں، انھیں موت سے گھبراہٹ نہیں ہوتی، ڈر نہیں لگتا۔ جس طرح دیہات کی صحت مند اور جفاکش اور متحرک عورتوں کے لیے ولادت (وضع حمل) کا عمل سہل، معمولی اور طبعی ہوتا ہے، اسی طرح ان انسانوں کے لیے جنھوں نے سادگی سچائی جفاکشی اور ہمدردی کے ساتھ زندگی گزاری ہے موت کا عمل سہل اور طبعی ہوتا ہے۔ نہ اندیشے نہ وساوس نہ الجھنیں، نہ خوف، نہ گھبراہٹ۔ انگریزی مصنف رے بریڈبری RAYBRADBARY نے اپنی دادی اماں کا ذکر اسی گروہ کے ساتھ کیا ہے۔ بڑی بی کے ساتھ میں ایک نہ ایک چیز ضرور ہوتی تھی۔ ہتھوڑی یا جھاڑو یا کوڑا اٹھانے کی ٹوکری یا پوچھا کرنے والا کپڑا یا ڈوئی۔ وہ ہر وقت ادھر سے ادھر جاتی ہوئی نہیں، تیرتی ہوئی، نظر آتی تھیں۔ انھیں کبھی کسی نے خالی ہاتھ یا بیکار یا آرام کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مکان کا ہر گوشہ ان کی ہمہ گیر گرفت میں تھا۔ انھوں نے کروڑوں کام انجام دیتے تھے۔ اب آخری سفر اپنی جگہ پر آنے والا تھا ایک شام انھوں نے تین زینے طے کیے اور تیسری منزل پر اپنے کمرے میں پہنچ گئیں۔ بستر پر دراز ہو گئیں اور ٹھنڈی سفید چادر تان لی۔ ایک اور آخری کام باقی تھا۔ مرنا انتہائی دلجمعی، باقاعدگی اور ذوق کے ساتھ انھوں نے یہ کام بھی کیا۔ سارے رشتہ دار جمع ہو گئے دادی اماں چلی گئیں تو ہمارا حشر کیا ہوگا۔ وہ بغیر نوٹس دیے جا رہی ہیں۔

"تم رو کیوں رہے ہو" بڑی بی بولی "وہ آدمی احمق ہے جو اپنے کٹے ہوئے ناخن بچا کر رکھتا ہے۔ کبھی تم نے کسی سانپ کو دیکھا کہ اس نے اپنی اتاری ہوئی کینچلی کی طرف مڑ کر بھی دیکھا ہو۔ آج اس بستر میں تم کیا دیکھ رہے ہو۔ کٹے ہوئے ناخن اور اتری ہوئی کینچلی۔ ایک گہری سانس سے کریں برف کے ٹکڑوں کی طرح بکھر جاؤں گی۔ میں مر کہاں رہی ہوں؟ جس کے نیچے زندہ ہوں کہیں وہ مرتا ہے؟.... میرے بارے میں اچھی اچھی باتیں کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے زندگی کا بھرپور لطف اٹھانا کھانے کی کون سی شے ہے جو میں نے مزا لے کر نہیں کھائی۔ زندگی کا کونسا رقص ہے جو میں نہیں ناچی۔ ایک چاشنی باقی تھی جو میں نے ابھی تک نہیں چکھی تھی، ایک راگ میں نے ابھی تک نہیں گنگنایا تھا۔ میں دیکھوں تو وہ چاشنی کیسی ہے؟ اس نغمہ کی دھن میں بھی تو الاپوں۔ تم سب لوگ اب جاؤ۔ مجھے سو جانے دو۔"

وہ اس خواب کے بارے میں سوچنے لگی جو وہ نوّے سال پہلے دیکھ رہی تھی کہ اچانک کسی نے اسے جگا دیا تھا۔ وہ اس کی پیدائش کا دن تھا۔ "میں اس خواب کو پھر جوڑ دوں گی" اور نوے سال کا یہ وقفہ جسے دنیا زندگی کہتی ہے، راستے سے ہٹ گیا، خواب کا سرا اس کے ہاتھوں میں آ گیا..... یہ تو بالکل ٹھیک ہے"۔ اس نے اطمینان کے ساتھ سرگوشی میں کہا، "زندگی کی دوسری چیزوں کی طرح یہ بھی اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ رہی ہے" اس کے چہرے پر ایسی طمانیت تھی، ایسا وقار تھا، ایسا بہاؤ جیسے کہ وہ ایک سانس لیتا ہوا سمندر ہو اور وہ سمندر کے ساتھ بہتی چلی گئی۔[1]

جو زندہ رہنا جانتے ہیں، مرنا بھی ان کے لیے سہل ہوتا ہے، موت کو وہ اسی ذوق و شوق کے ساتھ گلے لگاتے ہیں جیسے زندگی کو۔

---

[1] آخری سے پہلا پیراگراف اکتوبر ۸۶ء کے ریڈرز ڈائجسٹ سے ماخوذ ہے۔

vol. 61- No. 11-12 MAY-1987 Regd. No. D (SE) 105
Vol 62- No. 1-5
Telephone : 619807 R. N. 793/57
Telegrams : "KHAJGAN" New Delhi
THE MUNADI, NEW DELHI - 110013



میلاد نامہ اول رسول بیتی

از

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

خواجہ اولاد کتاب گھر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نئی د